برجستہ جواب

نظم :- عبدالغفار
نثر :- عبدالکریم

نظم :-

ملت بیضا

1) طالبانِ علم کی نالج کو کیا کہیئے نگار ٭ عدن کہتے ہیں عدن کو رُوم کو کہتے ہیں رَوم
ایک علامہ نے اظہارِ لیاقت یوں کیا ٭ ملت بیضا کے معنی لکھدیئے انڈے کی قوم

برتھ کنٹرول

2) لیٹے ہوئے تھے ریل کے ڈبے میں اک بزرگ
گویا کہ پوری برتھ وہی لے چکے تھے مول
ٹوکا کسی نے ان کو تو کہنے لگے جناب
نہرو کا حکم ہے کہ کرو برتھ کنٹرول

رضاکار

3) ایک علامہ سے کل میری ملاقات ہوئی
تھا بڑا ناز جنہیں اپنی زبان دانی پر
میں نے پوچھا کہ رضاکار کے معنی کیا ہیں
عجب انداز سے بولے کہ رضا کی موٹر

نثر :-

1) ایک مالک نے اپنے نوکر سے خفا ہو کر کہا کہ تو دراصل گدھا ہے اور خنزیر کا بچہ ہے ۔ نوکر نے نہایت ادب سے کہا کہ حضور آپ ہی تو ماں باپ ہیں ۔

2) ایک مالدار نے اپنے واسطے ایک مقبرہ بنوایا جب وہ تیار ہو گیا تو معمار سے پوچھا کہ اب اس میں کیا رکھنا چاہئے ۔ معمار نے جواب دیا کہ آپ کا وجود شریف

3) ایک وکیل نے کسی گواہ کی کج بحثی سے تنگ آکر کہا کہ تمہارے چہرے سے صاف بدمعاش کی صورت نظر آتی ہے گواہ نے جواب دیا کہ سبحان اللہ! یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا کہ میرا چہرہ آئینہ ہے ۔

اداریہ

از: سید قدرت اللہ

یہ اردو کی سحر طرازی ہے کہ کیرالہ جیسا ملیالی علاقہ بھی اردو کا شیدا ہوا جارہا ہے۔ گو صدیوں پہلے اردو زبان اس سرزمین میں داخل ہوچکی تھی۔ اشاعت کا کام بھی ہوا تھا مگر اردو کے شائقین اس قدر پیدا نہ ہوسکے۔ جس قدر آج کل دکھائی دے رہے ہیں اس علاقہ میں اردو کو پھلنے پھولنے کا موقع ماضی میں کیوں نہ ملا۔ اس سوال کا جواب انشاءاللہ کیرالا میں اردو کے نام سے عنقریب شائع ہوگا۔

بہرکیف اردو کی اشاعت پر کیرالا میں پہلے بھی کوشش جاری تھی۔ اور آج بھی مختلف ادارے کام کر رہے ہیں ان اداروں میں فاروق کالج بھی ایک خاص مقام کا مالک ہے۔

مجلس روضۃ العلوم کے زیر اہتمام ستمبر ۱۹۴۸ء میں فاروق کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ روضۃ العلوم کے اراکین کی اردو دوستی اور اردو نوازی تھی کہ ابھی ایک سال مکمل ہونے بھی نہ پایا تھا کہ شعبۂ اردو کا افتتاح فرمادیا اور اس کالج میں مذکورالذیل اساتذہ اگسٹ ۱۹۴۹ء سے اردو کی خدمت کرنے لگے۔

	تاریخ	مدت
۱) جناب سید محمد صاحب مدراسی	اگسٹ ۴۹ء	ایک ماہ
۲) ,, مولوی ایس۔ عبدالرحیم صاحب	دسمبر ۴۹ء	ایک ماہ
۳) ,, سید محی الدین صاحب	فروری ۵۰ء تا جون ۵۰ء	پانچ ماہ
۴) ,, کے۔ محمد یوسف صاحب	اگسٹ ۵۰ء	ایک ماہ
۵) ,, سید عبدالرب صاحب تمکوری۔ بی اے۔ آنرز۔	ستمبر ۵۰ء تا ۶۳ء	تیرہ سال
۶) ,, محمد نثار احمد صاحب میسوری ایم اے۔	۱۷ اکتوبر ۶۳ء تا ۶۵ء	تقریباً دو سال
۷) ,, محمد ابراہیم صاحب تخنگڈھ ایم اے۔	۶ جولائی ۶۵ء تا ۳۰ اپریل ۶۹ء	,, چار سال
۸) ,, فوزیہ بیگم صاحبہ میسوی ایم اے۔	یکم ستمبر ۶۹ء تا ۲۴ جولائی ۷۰ء	,, ایک سال
۹) ,, پھر قرعۂ فال بنام راقم نکلا		

خدا جانے اردو طلباء کی حوصلہ شکنی تھی یا اکثر اساتذہ کی سیماب کیفیت کہ تئیس (۲۳) سالہ شعبۂ اردو کو تاحال ابتدائی منزل میں ہی رہنا پڑا۔

پچھلے سال کی بہ نسبت امسال اردو طلباء کی تعداد میں سہ گنا اضافہ ہوکر بعونہ تعالیٰ ہمت افزائی دکھائی دے رہی ہے۔ طلباء نے حلقۂ مطالعۂ اردو کے نام سے ایک اردو مجلس بھی قائم کی ہے جسکی رسم افتتاح کیرالا کے مشہور اردو شاعر جناب ایس ایم سرور صاحب مصنف ارمغان کیرالا کے ہاتھوں ادا ہوئی اور جناب ایس محسن صاحب جھنگل ایم کام، ایم بی اے نے مخصوص مہمان بنکر اس جلسہ کو شاندار کامیابی عطا کی۔ اس کالج کے اردو دان اساتذہ کرام پروفیسر پی ایم عبدالشکور صاحب ایم اے اور جناب غلام مصطفےٰ صاحب ایم اے نے بھی اردو طلباء کی منعقدہ مجالس کو زینت بخشی اور یہ اردو طلباء کی کاوش کا نتیجہ ہی ہے کہ کالج میگزین میں اردو بھی شریک ہوکر آپ کے ہاتھ آگئی ہے خدا کرے کہ یہ سلسلہ قائم و دائم رہے۔

حلقۂ مطالعہ اردو اس سلسلہ میں قابل احترام پرنسپل کے۔ کے۔ عبدالجلیل صاحب کا بے حد شکرگزار ہے کہ انھوں نے اردو کو کالج میگزین میں شریک کرکے اپنی اردو ہمدردی کا ثبوت دیا۔

ایک تأثر

سید قدرت اللہ

۱۹۶۹ کی بات ہے کہ حسنِ اتفاق سے اپنے دیس میں دو مشہور و معروف شخصیتوں کی صد سالہ تقریب منائی گئی۔ ایک کی پیدائش کا صد سالہ جشن تھا اور دوسرے کی وفات پر صد سالہ برسی۔ ہر طرف غالب صدی اور گاندھی صدی کی دھوم تھی۔ آسمانِ صحافت پر ان بزرگوں کی ضیا پاش زندگی کئی ستارے طلوع ہوئے۔ مختلف ادبی و سیاسی رسائل میں ان کے کارنامے جگمگانے لگے۔ حکومت نے خراجِ عقیدت کے طور پر ان دونوں کے ڈاکیہ ٹکٹ بنوائے اور گاندھی جی کے نام کے سکے بھی جاری کر دئے۔ ملک بھر میں سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے ان تقریبات کا خیر مقدم کیا۔ سال بھر ان تقریبات کی رپورتاژ اور روئداد شائع ہوتے رہے۔ آج بھی اس سلسلہ میں کوئی نہ کوئی تبصرہ طبع ہوتا نظر آرہا ہے۔

یہ دونوں ہندوستانی مہاویر تھے۔ اسی سرزمین کے قابلِ فخر سپوت تھے۔ اسی مادرِ وطن کی آغوش کے تربیت یافتہ تھے اور آخری دم تک اپنے وطن کی خدمت میں لگے رہے اور جب انکی مقررہ میعادِ زیست ختم ہوگئی تو ایک کو موت کے سنگین پنجہ نے دبوچ کر پیوندِ خاک کر دیا اور دوسرے کو اسی ملک کے تنگ قوم و تنگ آدم نے اپنی گولی کا نشانہ بنا کر مادرِ وطن کے رخِ روشن پر بدنما داغ لگا دیا۔

اِن دونوں فرزندانِ ہند کی خدمت اور شہرت کے دائرے الگ الگ ہیں۔ ایک نے ادب کی خدمت کی اور دوسرے نے ملک کی۔ ایک نے زبان کو قدامت پرستی کے چنگل سے چھڑایا اور دوسرے نے ملک کو غلامی کے پھندے سے نجات دلائی۔ اس سلسلہ میں دونوں کو خطرناک راہ سے گذرنا پڑا۔ زندگی کی اس راہ میں کئی بار حوصلہ شکن نشیب و فراز آئے ان کی ہمتِ مردانہ کی داد دیجئے کہ انہوں نے یاس و حرماں کو قریب تک آنے نہ دیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں کا دور سیاسی انتشار سے معمور تھا۔ ایک سیاست دم توڑ رہی تھی اور دوسری سیاست اپنا سکہ جمانے پر مچل رہی تھی پورا ملک ذہنی کشمکش کے طوفان کا شکار ہو چکا تھا۔ ایسے ہیبت ناک دور میں بھی انہوں نے پر خلوص کارناموں اور دلکش خدمات سے ہزاروں دلوں پر قبضہ جما لیا اور اپنے اپنے حلقہ میں ایسی

فداکاری اور جاذبیت پیدا کردی کہ آج بین الاقوامی شہرت ان کے قدم چومنے پر مجبور ہوگئی اور کروڑہا پرستار ان پر نچھاور ہونے لگے۔

دونوں فطری طور پر انفرادیت پسند تھے اور دونوں میں جدّت پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی انہوں نے اپنے اپنے دائرے میں اپنی خصوصیات کی جھلک پیدا کردی تھی اور اس جھلک میں ذرے ذرے کو چاند اور سورج بنا دینے کا لوز پایا جاتا تھا اپنی پُرخلوص خدمات میں اس قسم کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے انہیں کافی جدوجہد کرنی پڑی تھی انہوں نے ہر وقت ہر موج بلا کو نسیم سحر کا روح پرور جھونکا تصور کیا طوفانِ حوادث کو حیات آفریں فضا جانا اور زندگی کے سخت سے سخت تر مرحلہ پر بھی انکے پائے استقلال میں ادنیٰ سی جنبش بھی نہ آنے پائی۔ ان کا نظریۂ حیات ڈاکٹر اقبال کی زبان میں ملاحظہ ہو۔

شمع کی طرح جئیں اس بزم گہِ عالم میں

خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں۔

غالبؔ نے اپنی گرانقدر خدمات سے حلقۂ اردو میں سیمابیت پیدا کر دی تھی۔ ان کی تخلیقات کے ہر ہر لفظ سے جدیدیت کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ ان کی عبارت آرائی پر فارسی شعراء کو بھی بعض جگہ سرنگوں ہونا پڑتا تھا۔ سادہ نگاری میں روزمرہ کی لذت پیدا کردی خطوط نویسی میں طرز جدید کے موجد بن گئے۔ مراسلہ میں مکالمہ کی شان پیدا کردی۔ سادہ نگاری کی بھینی بھینی خوشبو سے عطر بیز فضا پیدا ہوگئی۔ ظرافت کے پھولوں سے چمن اردو کے رونق میں اضافہ ہوگیا گدگدانے والے برجستہ چٹکلوں سے دامن اردو میں دلچسپ وسعت پیدا ہوگئی۔ شعری تخلیقات میں طویل نظم نگاری کے نقوش چھوڑے غزل میں معنی آفرینی اور جدت طرازی کے گل کھلائے۔ ان کے ہاں غزل اور نظم آپس میں گلے ملتے دکھائی دیتے ہیں۔ قصیدہ نگاری کے مقررہ اصول سے ایک قدم آگے تجاوز کر کے اسمیں وسعت پیدا کردی۔ مرثیہ کے موضوعات میں اپنی انفرادیت کے آثار چھوڑے۔ بہرکیف اکثر اصناف سخن غالب کی انمول خدمات کی وجہ اردو ادب میں رنگینیوں کا حسین ترین گلدستہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ انہوں نے اس مجموعۂ اردو کو بے رنگ میں کہا ہے مگر یہ رائے اردو کی تنگ دامانی کی ترجمان نہیں ہوسکتی یہ بھی انکسار غالب کی ایک نئی شان ہے اور حق یہ ہے کہ غالب کی یہ بے رنگی جلوۂ ہزار رنگ کا آئینہ ہے۔

گاندھی جی نے ہندوستانیوں کی زندگی پر ہر زاویہ سے نظر ڈالی اور ہر اصلاحی تحریک کا خیر مقدم کیا۔ رنگ و نسل اور چھوت چھات کی زہر آمیز اونچ نیچ کو ختم کیا۔ پست اقوام کا معیار زیست بلند کیا اور ملک میں امن آفریں فضا پیدا کرنے کے لئے اہنسا (عدم تشدد) کا نسخہ چلایا۔ 'اپنا کام آپ کرو' اور 'اپنی دنیا آپ پیدا کر' کے نعروں سے زندگی کی ڈھارس باندھی۔ نمک تیار کرنے اور چرخہ کاتنے میں خود بنفس نفیس شریک ہو کر بہت سے ساتھی بنالئے تعلیم و تربیت کے لئے کئی آشرم قائم کئے۔ ہندو مسلم اتحاد کے لئے کئی کئی میل پیدل چلنے کی زحمت

بخوشی گوارا کرلی۔ اور اسی اتحاد پسندی کی خاطر کئی کئی دن کے برت بھی رکھے۔ جن میں اکیس دن کا ایک طویل برت انکی اتحاد پسندی پر جان نثاری کی بہترین دلیل ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کو ملک کی حریت کا اہم ترین اصول جانا۔ حریت کی برقراری اور استحکام کے سلسلہ میں فرقہ دارانہ نفرت کو ملک کا بدترین مرض قرار دیا۔ بھارتی قومیت کو مضبوط کرنے کے لئے 'میں' اور 'میرا' کے احساس کو مٹا دینا ضروری سمجھا اور صاف طور پر بتا دیا کہ مختلف عوامی طبقات کے تمام مادی اقتصادی اور روحانی وسائل کو سب کی بھلائی کے لئے بلا امتیاز حرکت میں لانا ہی حقیقی جمہوریت ہے بہرکیف گاندھی جی نے اسی طرح ہندوستان کو امن و آزادی سے مزین کرنے میں ہر ممکن کوشش کی جس طرح غالب نے بھی حلقۂ اردو کو جدیدیت دیکر اس میں قوس قزح کی سی رنگینی پیدا کردی تھی۔ گاندھی جی تحریک آزادی کے پاسبان اور رقیب تھے تو غالب اردو ادب میں اختراع پسندی کے نگہبان اور نقیب۔

غالب کو زبان سے جس قدر انسیت تھی اسی قدر گہری محبت گاندھی جی کو اپنے ملک کے تمام باسیوں سے تھی۔ غالب نے زبان کو نکھار کر باوقار بنانے کی کوشش کی اور گاندھی جی نے ہندوستان کو آزاد کر کے باعزت اور امن پسند بنانے کی سعی فرمائی۔ بہرحال ان دونوں عزت مند ہستیوں کی گرانقدر خدمات کے طفیل آج بھی غالب پرست گروہ اور گاندھی پرست جماعتیں ملک و ادب میں جگہ جگہ جھلملاتی نظر آتی ہیں۔ مگر یہ جھلملاہٹ چراغ سحری کی ٹمٹماہٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی کیونکہ ان پرستاروں کے جذبات میں خلوص کی کمی آئے دن زیادہ ہوتی جارہی ہے اور غرض مندی کے بھیانک طوفان ملک میں ہر طرف حشر برپا کر رہے ہیں۔ اسکی اصل وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان بزرگوں کے عمرانی نظریات طاق نسیان کی رونق بن چکی ہیں۔ کاش ان پرستاروں کو ان عمرانی نظریات کی روشنی نصیب ہوجاتی اور ہندوستان کا خوشنما چہرہ اس بدنما داغ سے محفوظ رہ جاتا جس کی طرح ساحر لدھیانوی نے کیا خوب اشارہ کیا ہے۔

یہ جشن مبارک ہو لیکن یہ حقیقت ہے
ہم لوگ حقیقت کے احساس سے عاری ہیں

گاندھی ہو کہ غالب ہو انصاف کی نظروں میں
ہم دونوں کے قاتل ہیں دونوں کے پجاری ہیں

ماں کا پیار

محمود۔ اے۔ ڈی

آسماں بادل سے گھرا ہوا تھا۔ آندھی کی تیزی سے درختوں کی ہر ایک شاخ بیقرار تھی۔ اچانک بادل کی گرج سے رشیدہ کا سر چکرا گیا اس کا نور نظر آج بالکل خالی پیٹ مدرسہ گیا ہوا تھا۔ اس کے پاس چند ٹوٹے پیسے بھی نہ تھے جو اپنے بھوکے بچے کے ہاتھ تھما دیتی۔ بچہ بھی علم کے شوق اور مستقبل کی تعمیر میں اس قدر دلچسپی رکھتا تھا کہ ماں کی صرف میٹھی باتوں سے ہنستا کھیلتا مدرسہ روانہ ہو گیا۔

اس ماہ کسی قسم کی آمدنی نہیں سلائی کا کپڑا آئے ایک ہفتہ سے زیادہ عرصہ گذر چکا تھا۔ اور گھر میں کوئی چیز باقی بھی نہیں تھی آخر اپنی پڑوسن سے چاول ادھار لئے پیٹ کی آگ بجھانے کی تیاری کر رہی تھی اور اپنے ننھے منے کو مدرسہ سے واپسی کے بعد کھلانے پلانے کے منصوبے بنا رہی تھی۔ تیز آندھی اور وقت کی دھیمی رفتار سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ بادل کے گرجتے ہی اس کا دل کانپ جاتا تھا۔ آنکھیں سہم جاتی تھیں۔ رونگٹے کھڑے جاتے تھے اور زبان سے بے ساختہ نکل جاتا تھا کہ..... ہائے میرے پیارے ..... میرے دل کے سہارے۔ تجھ پر میں نے بہت ظلم کیا ہے مدرسہ بھیج کر میں نے ایک شدید غلطی کی ہے۔

اس طرح بڑبڑاتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں سر تھامے گم سم بیٹھ جاتی پھر خیالات میں مگن۔ کبھی کھڑکی کی طرف چلی جاتی کبھی دروازہ کھول کر باہر دیکھنے لگتی مگر دھواں دھار بارش کے سوا اسے نظر ہی کیا آتا تھا۔ سڑکیں پانی سے لبریز تھیں اور اس کا دل رنج و غم سے بھرپور۔ پھر خیالات میں محو ہو گئی کہ اس کا خاوند بچہ کو گود میں لئے باتیں کر رہا ہے۔

میرے لاڈلے تو کتنا پیارا اور کتنا حسین ہے تو سکون قلب اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے یہ تیری قسمت کا لکھا ہے کہ ایک لاری ڈرائیور کے گھر جنم لیا ہے اور ہفتہ عشرہ سے قبل تجھے اپنے باپ سے ملنا بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ مگر تیری پرورش میں اپنا سب کچھ قربان کر رہا ہوں اور یہ میری قسمت کی بات ہے کہ ایسی نوکری ملی ہے۔

کہ دس بارہ دن سے پہلے گھر لوٹنا نصیب نہیں ہوتا۔ راستے کے ہر موڑ پر جہاں کہیں کوئی بچہ نظر آتا ہے تو تیری تصویر آنکھوں میں گھوم جاتی ہے۔ میں مجبور ہوں بیٹا مجھے معاف کر۔ میری غیر حاضری میں میری رشی باپ کی شفقت و تربیت اور ماں کا لاڈ و پیار دونوں رول ادا کرنے میں بہت ماہر ہے۔

لاری لوڈ ہو چکی تھی اسے بمبئی ہو آنا تھا۔ ننھے آصف کو ماں کے حوالے کرنے کی بے حد کوشش کر رہا تھا مگر آصف کے ایک ہاتھ میں قمیص تھی اور دوسرے ہاتھ میں سر کے بال۔ باپ سے الگ ہونے کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ گرفت بہت مضبوط تھی۔ احمد نے خود کو چھڑانے کی بہت کوشش کی۔ آخر بہت مشکل سے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی کی اور دونوں ہاتھوں کو چومتے ہوئے رشیدہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا یہ لو اپنی امانت اور خدا حافظ کہتے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا۔ رشیدہ کو یہ معلوم نہ ہو سکا آج اس کے شوہر سے ایسے الفاظ کیوں صادر ہوئے اور اس سے بھی بے خبر تھی کہ وہ کب لوٹنے والا ہے۔

آج رشیدہ کے جسم کا ہر جوڑ ٹوٹ رہا تھا۔ ہر ایک طاقت سلب ہو چکی تھی۔ خاوند کی روانگی کے بعد کبھی اس قدر بے چینی کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ ایک طرف خاوند کا انتظار تھا دوسری طرف اپنے بھوکے بچے کی منتظر۔ اچانک اسے پھر رسوئی کا خیال آیا تو چولھے کی جانب دوڑی تو کیا دیکھتی ہے چولھا بجھا ہوا ہے۔ چاول جل چکے ہیں۔ آنکھوں میں پھر اندھیرا چھا گیا۔ سر چکرانے لگا اب مصیبت تو ایک نہ شد دو شد ہو گئی۔

یکایک لاری کی آواز آئی۔ خاوند کے استقبال کے لئے نکلی۔ دروازہ کھولی تو اس کا ننھا منا بارش سے تر بتر ہو کر آہستہ آہستہ چلے آ رہا تھا۔

سڑک کے تیز رفتار پانی کی وجہ سے پیر لڑکھڑاتے نظر آئے تو گود میں لینے لپکی۔ تو اچانک لاری آ گئی۔ ماں اور بچہ دونوں اپنے باپ کی لاش لاتے ہوئے لاری سے ٹکرا کر جاں بحق ہو گئے۔

شغل بے شغلی

از:۔ سیف الرحمٰن ۔ کے

شام کے سات بجے کا سماں تھا۔ سڑکوں پر گدھے ڈھینچوں ڈھینچوں کلبے ڈھب راگ گا رہے تھے۔ میں نے قمیص سے سگریٹ کیس اور لائٹر نکالا۔ ٹرچ .... لائٹر کے جلنے کی آواز کے ساتھ ہی ہوا کا ایک جھونکا لائٹر کو سرد کر دیا تو لائٹر دوبارہ جلانا مناسب نہ سمجھا۔

لیبلی منزل جو میرے کمرے کے بغل میں واقع ہے میری نظروں کا نشانہ بن گئی۔ جہاں دھیمی دھیمی روشنی اندھیرے میں گھلی جا رہی تھی ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا میں بالکل اداس اور اپنے خیالات میں مگن۔

نہیں! نہیں! وہ تو اب میرے لئے ناقابلِ برداشت بوجھ بنتا جا رہا ہے اور کچھ نہیں تو کم از کم اسے سبق تو ملنا چاہئے کہ وہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ اسکی ان حرکتوں سے ہم کتنے پریشان ہیں اور ہمارا کتنا نقصان ہوا جا رہا ہے۔

ارے ارشد آج پھر تم نے میرا پین توڑ ڈالا۔ بس کرو یار! ارشد میاں جو لیبلی منزل کے نئے باسی تھے۔ میرے پڑوسی ہی نہیں بلکہ ایک جگری دوست بھی اور پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب یہ نئے نئے اس کوٹھی میں آئے تھے۔ میں اسی دن شام میں حجام کی دوکان پر جو ہمارے شہر کی ایک نشر گاہ ہے الیکشن کے بارے میں اپنے ساتھیوں سے گفت وشنید کر رہا تھا اور ارشد میاں بال کٹوانے وہاں تشریف لائے تھے اور یہ بھی شریک گفتگو ہو گئے تھے بس اس کے بعد بلاناغہ ملاقات ہوتی رہی۔ ارشد دل کے دیالو۔ وعدے کے پکے۔ باتوں کے دھنی ہیں تو آڑے وقت دوسروں کی خدمت کرنا ان کا شیوا ہے۔

مگر صد افسوس! بے چارہ ایک مہلک وبا میں گرفتار تھا۔ یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ آیا یہ بیماری دماغی ہے یا جسمانی۔ جب آتے تو پہلے خیر خیریت دریافت فرماتے پھر پان بیڑی کا دور شروع ہوتا۔ پھر گپ بازی۔ دل لگی۔ شاعری اور کچھ تبصرے۔ اس طرح گفتگو کا آغاز ہوتا۔ مگر اختتام سے بے تعلق۔ کبھی سگریٹ کی راکھ سے کھیلتے رہتے کبھی پان کے ٹکڑے کرنے میں مصروف۔ ایش ٹرے لیا کھولنے کی کوشش۔ اس طرح کی کہ ٹوٹ گیا۔ ٹم پیس کی الارم بجانے کی کوشش کی الٹی سیدھی کنجی چلائی بے کار کر کے چھوڑ دیا۔ ارشد میاں کی کرامت کہیے کہ ان کے جسم کے اکثر اعضا مصروف کار۔

اتوار کا دن تھا۔ حسبِ معمول چھٹی تھی۔ بیٹھے بٹھائے مصیبت مول لینے کہیے طبیعت اکتانے لگی تو ریسیور اٹھایا اور فون پر ہی باتیں کرتے ہوئے جی بہلانے لگا یکایک گفتگو منقطع ہو گئی۔ ریسیور رکھکر میں نے اپنے چچا زاد بھائی ابراہیم سے بوچھا۔ 12۔ نمبر بندوق لی۔ سیر و تفریح کا منصوبہ تیار کر ہی رہا تھا کہ میاں موصوف کمرے میں ٹپک پڑے اور ہماری گفتگو میں اسطرح شامل ہو گئے گویا پہلے سے اس منصوبہ بندی میں موجود تھے۔ کبھی مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کبھی میری پیٹھ تھپکی۔ کبھی ناک میں انگلیاں ڈالے کبھی پین اٹھایا جوش میں آکر میز پر دے مارا۔ اب بندوق پر ہاتھ پہنچا ہی تھا کہ ابراہیم نے جھٹ سے ارشد میاں کو روک دیا اور بندوق لے جا الماری میں رکھ دی۔

ارشد میاں کو ابراہیم کی اس حرکت سے بہت ملال ہوا جھٹ سے میں نے کہا۔ ارے ارشد! آج پھر تم نے میری پین توڑ ڈالا۔ بس کرو یار۔ ارشد نے معافی مانگتے ہوئے گفتگو جاری رکھی اور موضوع تھا شیر کا شکار۔

پھر اسی اثناء میں ایک کتاب پھاڑ ڈالی ایک دوات نیچے گرادی۔
بس اس دن ان کا آنا وبال جان بن گیا۔ اور یہ مصیبت تو اپنے ہاتھوں خریدی تھی مگر یاروں سے دشمنی کیسی۔ اتنے میں والد صاحب نے خبر دی کہ شہر میں ایک تجربہ کار عمر رسیدہ حکیم صاحب تشریف لائے ہیں۔ والدہ کی علالت پر گفتگو کرنے لگے تو مجھے خیال آیا کہ یہ بہترین موقعہ ہے کہ ارشد میاں کا علاج کروایا جاسکتا ہے۔
دوسرے دن ارشد میاں کو بہلا پھسلا کر حکیم صاحب کے ہاں لے گیا علیک سلیک کے بعد میں نے مریض کی کارگذاریاں سامنے رکھیں۔

حکیم صاحب نے کہا صاحب زادے اس کا علاج تھوڑے ہی ہوسکتا ہے؟ پھر ارشد سے متوجہ ہو کر کہا ارے میاں تم نے تھرما میٹر توڑ دیا۔ یہ شغل بے شغلی کا مقام نہیں ہے۔